سیرت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں جدید ریاست کا تصور

پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی ☆

الحمد الله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين .

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ پہلے فرد کی اصلاح ہو' اس کی تعلیم وتزکیہ کے عمل سے گذر کر امت اسلامیہ کی تشکیل ہو' اور اس امت واحدہ کے واضح تصور اور عملی ڈھانچہ کی بنیاد پر ریاست کا قیام کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ اگر افراد کی تربیت ان مقاصد اور اصول کے مطابق انجام پا جائے جو خالق کائنات نے عطا فرمائے ہیں اور ان افراد کو ایک مضبوط سماجی بندھن کی لڑی میں ان قواعد وضوابط کے مطابق پرو دیا جائے جو اللہ کی شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں' تو انہی افراد اور معاشرہ کی مدد سے وہ بہترین ریاست قائم کی جاسکتی ہے جس کا مطمح نظر اعلاء کلمۃ اللہ اور رضائے رب کا حصول ہوتا ہے۔ لیکن اگر پہلی دو شرطوں میں سے کسی ایک میں کوئی کمزوری رہ جائے تو یہ کمزوری ریاست کے ڈھانچہ میں بھی نمایاں نظر آئے گی۔ پھر وہ ریاست مادی قوت ومعاشی وسائل پر تو شاید قابض ہو کر دکھا دے مگر اس کی اخلاقی بنیاد کمزور اور نظریاتی اساس کھوکھلی رہے گی۔ ایسی ریاست محض اپنی سیاسی قوت اور مادی وسائل کے بل بوتے پر افراد واجتماع انسانی کو راہ راست پر نہیں چلا سکتی۔ البتہ اگر ریاست کی تشکیل میں یہ دونوں بنیادی عنصر پوری طرح کارفرما ہوں تو پھر یہ ریاست ان عناصر کی تقویت اور ترقی کا باعث ضرور بن سکتی ہے اور یہی دراصل اسلامی ریاست کا اصل فریضہ اور جواز بھی ہے۔

☆ پروفیسر ادارہ تحقیقات اسلامی۔ و مدیر ''الدراسات الاسلامیہ''
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد

اسی ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے افراد کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ ان کو قبول حق پر آمادہ کیا' ان کو تزکیہ نفس کے ذریعہ اندر سے بدل ڈالا ان کو تعلیم کتاب وحکمت کے ذریعہ بہترین انسان بنا کر امت اسلامیہ کی تشکیل کی۔ جونہی امت کی ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئی اس ہیئت کے اجتماعی مقاصد کی تکمیل اور سماجی مصالح کی تحصیل کے لیے ریاست کا قیام آسانی سے عمل میں آگیا۔ اس ریاست کو قائم کرنے اور باقی رکھنے کے لیے کسی خارجی طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ ہی افراد کو اس ریاست کا وفادار رکھنے کے لیے کبھی قوت سے کام لینے کی نوبت آئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں جو مثالی ریاست قائم فرمائی اس میں نہ تو پولیس کا کوئی ادارہ تھا' نہ ہی پروپیگنڈہ کی کوئی مشینری تھی' نہ شہریوں کی مخبری کرنے کے لئے کوئی محکمہ قائم کیا گیا۔ اس لیے کہ ان اسباب ووسائل کی ضرورت ہی اس ریاست میں پڑتی ہے جس کا رشتہ اپنے شہریوں کے ساتھ باہمی احترام واعتماد پر استوار نہ ہو۔ بلکہ حکام اور محکومین کے مابین ایک لامتناہی کش مکش جاری رہے۔ لیکن اگر ریاست ایسی ہو کہ اس کے اغراض ومقاصد' مفادات وترجیحات بعینہ وہی ہوں جو اس کے شہریوں کے مابین مشترک ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسی ریاست جبر وقہر کے ذرائع اختیار کرنے سے بالکلیہ بے نیاز رہے گی۔

۱: لہذا رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں جدید ریاست کا پہلا اصول یہ نکلتا ہے کہ ایسی ریاست جو سو فی صد اس عقیدہ' شریعت' اخلاقی اور تہذیبی مقاصد پر قائم ہو جو اسکے شہریوں میں مشترک ہیں تو وہ ریاست میں ہمیں ملتی ہے۔ اس طرح یہ ریاست ہر شہری کی نظر میں اس کے ذاتی نصب العین کی تکمیل کا رمز اور ذریعہ ہوگی۔ اور یوں بقول شاہ ولی اللہؒ' اس ریاست کی حیثیت ایک شخص اکبر کی سی ہوگی جس میں افراد کو اپنے تصورات اور خوابوں کی تکمیل کا سامان ہوتا نظر آئے گا۔ اس طرح اس ریاست کے لئے خود اپنے شہریوں کی وفاداری کے حصول وبقاء کا کبھی کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

۲: دوسری خصوصیت اس جدید ریاست کی جو ہمیں اسوۂ رسول اکرم ﷺ سے ملتی ہے کہ اس ریاست میں عدل وانصاف کا ایک محکم' جامع اور مربوط نظام قائم ہو۔ بظاہر یہ کوئی نئی بات

نہیں لگتی' اس لیے کہ ہر ریاست ہی اپنے دعوے کی حد تک اس خصوصیت کی علمبردار ہے۔ اس باب میں اسلامی ریاست کی امتیازی حیثیت کیا ہے ؟ وہ امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اول تو اس نظام عدل وانصاف کا پھیلاؤ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو' کوئی گوشہ کوئی عمل اور کوئی رویہ اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہتا۔ دوسرے اس نظام کی رو سے انسانوں کو حقوق کے بجائے فرائض کے بجالانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سارے انسان پوری ذمہ داری اور تن دہی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض پر کاربند ہونے کی سعی کریں گے تو اس کے نتیجہ میں ان سب کے حقوق خود بخود ادا ہونے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری سیرت طیبہ میں ہمیں کہیں حقوق انسان کا پرچار نہیں ملتا۔ ہمیں سیرت طیبہ میں اس بات کی کوئی نشاندہی نہیں ملتی کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو' عورتوں کو' جوانوں کو' بچوں کو' بوڑھوں کو یہ تلقین فرمائی ہو کہ اپنے اپنے حقوق کے لئے دن رات لڑتے رہو' اور باہم جنگ وجدل کے میدان میں ڈٹے رہو۔ ایک نہ ایک دن تمہیں حقوق مل جائیں گے۔ اس طرح کا کوئی نعرہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں تو کیا شاید پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا کہ مزدور و متحد ہو جاؤ۔ کسانو جمع ہو جاؤ' خواتین یکجا ہو کر مردوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں یا نوجوان بوڑھوں کے مقابلہ میں منظم ہو کر لڑیں۔ ایسی تمام لغویات سے سیرت نبی ﷺ بالکل پاک نظر آتی ہے۔ اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ انسان کا جو تصور آنحضور ﷺ کی تعلیمات میں ملتا ہے وہ کسی جنگجو برسرپیکار متنازع للبقاء فرد کا تصور نہیں ہے' جو ہمہ وقت اپنے کو غالب اور دوسروں کو مغلوب کرنے کی سعی پیہم میں گرفتار ہو' اور ہر طرح سے لڑ کر اپنے مزعومہ حقوق کے حصول کی جدوجہد میں لگا ہوا ہو بلکہ جو تصور آپ نے ہمیں دیا' وہ یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر اپنی اصل کے اعتبار سے سلیم الفطرت پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق بہترین نہج پر ہوئی ہے' اس کو بہترین سانچہ میں ڈھالا گیا ہے' اس کے ضمیر میں روح ربانی کا خمیر رکھا گیا ہے' اللہ کی پیدا کردہ اس فطرت انسانی کا اصل تقاضا ہی محبت و بے لوثی ہے۔ اس میں سچائی' وفاداری' قربانی' نیکوکاری کے جذبات موجزن ہیں۔ یقیناً اس مخلوق کی کچھ ذاتی' جبلی' مادی خواہشات بھی ہیں۔ مگر ان خواہشات سے بھی قوی تر اس کے قلب وذہن اور عقل وشعور کے کچھ اعلیٰ روحانی اور اخلاقی تقاضوں کی تکمیل بھی چاہتا ہے۔ لہذا یہ مخلوق جس کا نام

انسان رکھا گیا جو الس سے ماخوذ ہے 'موانست یعنی (Sociality) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح یہ پانی' غذا' ہوا اور جبلی ضروریات کی تسکین کے بغیر نہیں رہ سکتا اس طرح انسان اپنی تخلیق کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد کے تکمیل میں بھی سرگرداں رہنا چاہتا ہے اور اسکے بغیر اس کی شخصیت ناقص و نامکمل رہتی ہے۔ انسان کے بارے میں اس طرح کے تصور کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ حقوق کے حصول کی خود غرضانہ اور یکطرفہ جدوجہد کی جڑ کٹ جاتی ہے' یا کم از کم اس کوشش کو انسانی ترجیحات میں اوّلیت تو بالکل حاصل نہیں رہتی۔ البتہ فرائض وواجبات پر انسانوں کی توجہ ہمہ وقت مرکوز کر کے بالواسطہ طور پر تمام انسانوں کے حقوق کی ضمانت فراہم ہو جاتی ہے۔

دوسری امتیازی بات اس نظام عدل وانصاف کی یہ ہے کہ اس کا قیام محض کسی ایک ادارہ یا مخصوص افراد کے گروہ کی ذمہ داری نہیں کہ معاشرہ کے باقی افراد اس سے بری الذمہ ہوں بلکہ یہ معاشرہ کے ہر فرد کی اپنی اپنی جگہ مستقل ذمہ داری ہے کہ وہ زندگی کے ہر قدم پر' انسانی تعلقات کے ہر مرحلہ میں عدل وانصاف کو قائم رکھے۔ وہ اس فرض کو ادا کرنے کا اسی طرح ذمہ دار ہے جیسے ریاست کا کوئی بڑے سے بڑا منصف و منصب دار' اور ہر فرد اس ذمہ داری کو انجام دینے کے معاملہ میں بذات خود براہ راست اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس طرح ریاست کے عہدیدار اور اعلیٰ مناصب کے حامل افراد بھی بالآخر اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں' اسی طرح ہر فرد اپنے ہر قول' فعل' اور عمل کو انجام دینے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے' اور اس کو قیامت کے دن کی باز پرس کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی جو اصل بنیاد ہے یعنی افراد کا اللہ کے ساتھ ایمان اور عبودیت کا تعلق' اس بنیاد کو کسی سطح پر بھی اکھڑنے نہیں دیا جاتا بلکہ ہر ہر عمل اور کوشش کے ذریعہ جو اس معاشرہ میں انجام دی جاتی ہے اس بنیاد کو زیادہ سے زیادہ قوی اور مستحکم بنایا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر افراد کو عدل وانصاف کے ہمہ گیر اور جامع تصور کے مطابق اپنی اپنی جگہ اس نظام کے قیام اور مسلسل تقویت کے لیے اپنی اپنی ذمہ داری انجام دینی ہے۔ یوں پورے معاشرہ میں ہر سطح پر عدل وانصاف کا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ البتہ بعض اجتماعی امور میں جن کا تعلق عمومی اخلاقی اقدار اور اجتماعی مقاصد کی حفاظت سے ہوتا ہے' اس کام کو انجام دینے کے لیے باقاعدہ عدلیہ کا ادارہ بھی اپنی جگہ کام کرتا

ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں عدلیہ کے ادارہ کا کردار انتہائی محدود ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ظلم وزیادتی کے معاملات کو عدلیہ کی سطح پر آنے سے بہت پہلے ہی انسانی شعور، خاندانی ضمیر، اور اجتماعی مواخذہ کی سطح پر حل کر لیا جائے، اور مظلوم کو اس کا حق دلا دیا جائے تاکہ حقوق و فرائض کے درمیان جو توازن معاشرہ نے قائم کر رکھی ہے اس کا توازن برقرار رہے۔ البتہ ایسے غیر معمولی معاملات جو اس قدر گھمبیر اور سنجیدہ حد تک پہنچ جائیں کہ ابتدائی سطحوں پر ان کا علاج نہ ہو سکے ان نزاعات سے باقاعدہ عدلیہ کی قوت قاہرہ کو کام میں لا کر نمٹا جائے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا ایک مشہور فرمان انتہائی غور طلب ہے: ایک موقعہ پر بطور قاضی آپ نے فیصلہ دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: بعض اوقات تم میں کچھ لوگ زیادہ موثر گفتگو کر کے اپنے معاملہ میں مضبوط دلیل لے آتے ہیں، اور یوں فیصلہ اپنے حق میں کرا لیتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں قاضی صرف ظاہری دلائل و شواہد کی بنیاد ہی پر فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو! اگر کسی نے ناجائز کسی کا حق اپنی چرب زبانی، طلاقت لسانی، یا چالاکی کی بنیاد پر مار لیا تو آخرت کی عدالت میں وہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ اور اس کو اس احکم الحاکمین کی عدالت کا سامنا بہر حال کرنا ہوگا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام عدل وانصاف کو درحقیقت جس محکم بنیاد پر استوار کیا گیا ہے وہ آخرت کی جواب دہی کا راسخ تصور ہے۔ یہی تصور انسان کے ضمیر کے اندر ایک پولیس مین بٹھا دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کا ضمیر زندہ ہو اور اس کو واقعی مرنے کا یقین اور مرنے کے بعد مالک یوم الدین کے سامنے پیش ہونے کا احساس ہو تو وہ بے شمار ناانصافیوں سے باز رہے گا، اور اس کا ضمیر کسی خارجی دباؤ کے بغیر کسی وقت بھی عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں برتے گا۔

۳: رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے ملنے والا جدید ریاست کا تیسرا اصول یہ ہے کہ تمام انسان مرتبے اور حقوق میں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو معزز اور مکرم بنایا ہے۔ ''ولقد کرمنا بنی آدم۔'' یہ بالکل فطری بات ہے کہ عزت کا اصل معیار ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت ارضی کی ذمہ داری تفویض کی ہے اور ذمہ داری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ صلاحیتیں بھی انسان کو تفویض کر دی جائیں جن کو کام میں لا کر انسان اس

ذمہ داری کو انجام دے سکے۔ اس لیے انسان کو دل، دماغ، اعضاء جوارح، ذہن، ضمیر، مشاہدہ، غرضیکہ وہ تمام صلاحیتیں عطا کر دی گئی ہیں جن کے ذریعے وہ منصب خلافت کے فرائض ادا کر سکے۔ ان تمام صلاحیتوں کو عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ نے تفویض کر دیا کہ وہ چاہے تو خلافت کا منصب سنبھالے اور چاہے تو اپنے مقصد وجود ہی کا منکر ہو جائے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر انسان کی تکریم و توقیر کیا ہو گی کہ سب کچھ دے کر بھی قبول و رد کا اختیار اسے تفویض کر دیا گیا۔ اسی بات سے متاثر ہو کر رابندر ناتھ ٹیگور کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا:

"I love God because he has given me the freedom to deny him"

انسان کے لیے جو منصب خلافت اس کائنات میں تجویز ہوا ہے اس کے یہ سب تقاضے منطقی طور پر باہم مربوط ہیں۔ خلافت کا مطلب ہے ذمہ داری۔ یعنی اللہ کے عطا کردہ اختیار کو استعمال کر کے اور اسکی عطا کردہ آزادی کو کام میں لا کر اس فانی زندگی میں اپنے ارادہ سے حکم الٰہی کی بجا آوری اور اس کی رضا کا حصول، اس ذمہ داری کے ساتھ اس کو وہ تمام ملکات عطا کر دیئے گئے جو اس فریضہ کی انجام دہی میں ممد و معاون ہوں، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کائنات میں پوشیدہ تمام قوتوں کو دریافت کرنے کا جذبہ اور ان پر دسترس حاصل کرنے کی ذہنی، عقلی، اور فکری صلاحیتیں بھی انسان کو ودیعت کر دی گئیں۔ پھر جب ذمہ داری ملی، صلاحیتیں ملیں تو ان دونوں اوصاف کے ساتھ تیسری صفت بھی منطقی ربط رکھتی ہے اور وہ ہے انسان کا معزز و مکرم ہونا۔ انسان کو جو مقام و مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ دین میں تفویض کیا گیا ہے وہ کسی دوسرے دھرم، ثقافت، نظریہ یا سیاسی و اجتماعی فلسفہ میں نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ یہ مرتبہ انسان کو انسانوں نے نہیں بلکہ خود اس کائنات کے اور انسانوں کے خالق و مالک نے عطا کیا ہے، کوئی اس کو اس سے لے نہیں سکتا۔ دنیا کا کوئی قانون، کوئی دستور، کوئی رسم و رواج، کوئی پارلیمنٹ، کوئی عدالت انسان کو اس مرتبۂ عزت و تکریم سے محروم نہیں کر سکتی جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کر دیا ہے۔ یہ تو بہت عامیانہ اور سطحی سی بات ہے کہ انسانی مساوات کا تصور اسلام نے دیا ہے،

مساوات تو اس اعلیٰ اعزاز اور ارفع توقیر و تکریم کے آگے کچھ بھی نہیں جو انسان کو اللہ کے ہاں سے مل چکا ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی تمام تعلیمات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ کی نظر میں مرد مومن کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس پوری وسیع و عریض کائنات میں اس کا کوئی مثیل نہیں۔ یہ چاند، سورج، پہاڑ، سمندر، شجر و حجر، چرند و پرند، یہ اجرام فلکی تمام سیارے اور ستارے انسان کی خدمت پر مامور ہیں، اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مسخر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب نے بیک آواز اس عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کے مقابلہ میں اپنی کمزوری، ناتوانی اور بے بضاعتی کا اعتراف کیا۔

''انا عرضنا الا مانة علی السموات والارض والجبال فأبین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوما جهولا'' (الاحزاب: ۷۲)

انسان کی یہ حیثیت جس میں بنی نوع انسان کے تمام افراد برابر ہیں، عقیدہ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ خالق کائنات کا تمام انسانوں کے ساتھ رشتہ خالق اور مخلوق اور عبد اور معبود کا رشتہ ہے۔ کسی کی مجال نہیں ''ابناء اللہ واحباءہ'' ہونے کا جاہلانہ اور گمراہ کن دعوی کرے۔ ہر انسان کو اللہ نے الگ امتیازی اور منفرد شان کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ہر ایک کو اپنے مالک کے سامنے اکیلے ہی اپنے اعمال نامہ کے ساتھ پیش ہونا ہے۔ ''کلهم آتیه یوم القیامة فردا'' (مریم: ۸۰) یہ درست ہے کہ اس نے انسانوں کے مابین معیار عزت، تقوی کو قرار دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی فراموش نہ کیجئے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے ایک سے زیادہ موقع پر اس بات کی بھی یاد دہانی کرائی ہے کہ تقوی ایک باطنی / قلبی / کیفیت کا نام ہے۔ ظاہر اعمال محض اس اندرونی حقیقت کی بیرونی علامات ہیں اور انسان کی اندرونی کیفیات و احساسات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ایک موقعہ پر تو آپ نے اس حقیقت کو تین مرتبہ دھرایا اور اپنے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

''التقوی ههنا التقوی ههنا التقوی ههنا''

آپ کا مقصد اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تم اس دینا میں ہی اپنے تقویٰ کے زعم میں گرفتار نہ ہو جانا کہ یہ زعم ہی تقویٰ کی نفی ہے۔ ادھر کسی کے دماغ میں اپنی برتری کا خناس پیدا ہوا ادھر اس کا تقویٰ رخصت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی' آپ کے عظیم جانثار ' مخلص' مدرگار اور مصاحبِ مزار یہ تک فرما گئے ہیں کہ اگر قیامت میں یہ اعلان ہوا کہ سب کا حساب کتاب ہو گیا اور ایک آدمی باقی ہے' تب بھی مجھے یہ دھڑکا رہے گا کہ کہیں وہ میں نہ ہوں۔

اسلام اور پیغمبر اسلام کی ان واضح اور واشگاف تعلیمات کی بناء پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس جدید ریاست کا جو آں حضور کے اسوہ کی روشنی میں آج قائم ہونی چاہیئے تیسرا سنہری اصول یہ ہے کہ اس ریاست میں انسان کی عزت و وقار' ناموس اور آبرو کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ مدینہ کی مثالی ریاست کی بناء ہی اس بات پر رکھی گئی کہ اہل ایمان کی ایک برگزیدہ جماعت نے خود اپنے ارادہ اور اختیار سے اللہ کے سچے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا' اپنے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آپ کی تابعداری کو قبول کیا۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے قبول عام کے نتیجہ ہی میں تو وہ وفادار رجال کار تیار ہوئے جنہوں نے اسلامی امت کی تشکیل کی یا بالفاظ دیگر ان ہی برگزیدہ اللہ کی پسندیدہ ہستیوں کا نام اسلامی امت تھا۔ یا یوں کہیئے کہ جب اہل ایمان آنحضرت ﷺ کی قیادت میں بنیان مرصوص بن کر کفر و طاغوت کے مقابلہ میں یکجاں ہو گئے تو اس جسد واحد کا نام اسلامی امت رکھا گیا۔ اس جسد ملی کے اجزائے ترکیبی گوشت پوست کے' دھڑکتے دل رکھنے والے' روشن ضمیر' سچے اور بے لوث انسان تھے جن دیانت امانت' صداقت اور بے مثال قربانیوں کی گواہی قرآں کریم نے بار بار دی ہے اور صیغہ ماضی کی یقینی اور ناقابل تغیر تاکید کے ساتھ یہ اعلان جگہ جگہ دہرایا ہے! ''رضی اللہ عنہم ورضوانہ'' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے''۔ اس حقیقت سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلامی معاشرے کے کل پرزے ایمان و یقین سے معمور افراد ہیں' ایسے مخلص اور فعال افراد کے اتحاد و یکانگت' تراحم و تعاون سے ہی اسلامی ریاست کل بھی وجود میں آئی تھی اور آج بھی آسکتی ہے۔ اگر ایسا ہے اور واقعتاً ایسا ہی ہے اسکے علاوہ کچھ نہیں ہے تو یہ بات صاف صاف کہنی چاہیئے کہ جب تک انسانوں کو کسی معاشرہ میں یا ریاست میں اعلیٰ ترین عزت و توقیر کا مقام نہیں ملتا اس وقت

تک وہ ریاست اسلامی تو کجا انسانی ریاست کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہو سکتی۔

۴: اس تیسرے اصول سے مربوط چوتھا اصول خود بخود یہ نکلتا ہے کہ اسلامی ریاست جس نہج پر آنحضرت ﷺ نے قائم فرمائی جس کو ہمارے علماء نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نام دیا اس کی اسلامیت کا ایک بڑا معیار یہ تھا کہ اس نظام سیاست میں ریاست کمزور کا دفاع کرتی تھی۔ یعنی ریاست کی پوری قوت اس کے تمام وسائل قوی کے مقابلہ میں ضعیف' طاقتور کے بجائے کمزور اور تونگروں کے مفادات کی پشت پناہی کرنے بجائے غریبوں 'بے کسوں اور ناداروں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ آپ کی پوری حیات طیبہ اس سنہری اصول کی واضح نشاندہی کرتی ہے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص ترین ساتھیوں نے خلفاء راشدین کی قیادت میں آپ کا اتباع کرتے ہوئے اسی اصول کو پوری قوت سے نافذ کیا اور اس پالیسی کو مکمل اخلاص سے جاری اور ساری رکھا۔ حضرت ابو بکر الصدیق جو خیر البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں اور آپ کے یار غار و جارِ مزار ہیں' آپ کو جب خلیفہ منتخب کیا گیا تو آپ نے سب سے پہلا پالیسی بیان ہی یہ جاری کیا۔

''القوی منکم ضعیف حتی اخذ منه الحق والضعیف منکم قوی حتی ارد الیه حقه''

یعنی تم میں سے جو قوی ہے طاقت ور ہے بااثر سمجھا جارہا ہے وہ میری نظر میں اس وقت تک کمزور رہے گا جب تک کہ میں اس سے کمزور کا حق نہ دلوادوں اور اسی طرح تم میں سے جو کمزور ہے' مجبور اور لاچار ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اس کو نہ پہنچادوں۔

اگر جناب صدیق اکبرؓ کے اس پالیسی بیان کو بنظر غائر دیکھا جائے اور اس کے مندرجات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا اس انتہائی جامع اور پر مغز بیان میں اسلام کی ساری پولیٹیکل سائنس سمٹ آئی ہے۔ اس لیے کہ ان الہامی الفاظ میں جناب رسول کریم ﷺ کے قریب ترین ساتھی اور رفیق عبداللہ العتیق نے سیاسی طاقت کا پورا فلسفہ سمو دیا ہے۔ یعنی ریاست کے جملہ وسائل اسباب قوت صرف کیے جائیں گے عدل وانصاف کی مکمل بالادستی کے

لیے اور کرامتِ انسان کی حفاظت وحمایت میں۔ اس ریاست کی قوت سے کمزور و مظلوم قوت حاصل کریں گے۔ یہ ریاست ظالم و جابر کے خلاف ہمہ وقت بر سر پیکار رہے گی۔ صرف عدل وانصاف پر کاربند افراد ہی اس ریاست کے دوست سمجھے جائیں گے اور ظلم و تعدی کی ہر شکل چاہے وہ کسی سطح پر بھی، جس پیمانے کی بھی ہو، اندرونی ہو یا بیرونی، وہ اس ریاست کا سب سے بڑا نشانہ بنے گی۔ اس بیان سے سیاسی طاقت کا یہ منفرد نظریہ نکلتا ہے کہ ''طاقت خود فی نفسہ مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ مطلوب و مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے اور اصل مطلوب و مقصود حکم الٰہی اور شریعت خداوندی کے مطابق عدل وانصاف کا قیام ہے۔ اگر ریاست اپنے ذرائع قوت و وسائل شوکت کو اس مطلوب و مقصود کے حصول اور بقاء، ترقی اور تقویت کے لیے استعمال نہیں کرتی تو وہ اپنے وجود کا کوئی جواز نہیں رکھتی، اس کو باقی رہنے کا کوئی حق نہیں''۔

بنا بریں آج کی جدید اسلامی ریاست کی اسلامیت کو جانچنے کا ایک بڑا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اس ریاست میں کمزور، مجبور، مظلوم، بے کس، نادار، لاچار کتنے لوگ ہیں؟ ان کی نسبت آبادی میں کتنی ہے؟ اور یہ لوگ تعداد میں جتنے بھی ہیں ان کے ساتھ ریاست کی مشینری کا کیا رویہ ہے؟ ان کی دادرسی کا ریاست کی طرف سے کیا سامان کیا گیا ہے اور ان کو اس حال میں پہنچانے والے ظالموں، سرکشوں اور اللہ اور اس کے رسول کی کھلی نافرمانی کر کے خلق خدا کو پریشان کرنے والوں کے ساتھ ریاست کے ذمہ داروں کا کیا رویہ اور سلوک ہے؟

۵: رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں جدید ریاست کا پانچواں اصول یہ ہے کہ اس کے حکام اور اہل کار اس کے شہریوں کا اعتماد رکھتے ہوں۔ عام لوگوں کو ریاست کے مختلف منصب داروں کی اہلیت، دیانت اور ملی خدمات انجام دینے کی صلاحیت پر پورا یقین ہو۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی قائم کردہ ریاست میں تو یہ خصوصیت اپنی مثالی شکل میں موجود ہی تھی، آپ کے بعد خلفاء راشدینؓ نے بھی اس اصول کو پوری طرح قائم رکھا۔ نہ صرف یہ کہ ریاست کے سربراہ خلیفہ سے لے کر حکومت کے ادنیٰ ترین اہلکار تک دیانت امانت اور اہلیت کے اعلیٰ ترین معیار کے حامل افراد تھے، بلکہ ان کے تمام کاموں پر کھلی تنقید کی عام اجازت عام لوگوں تک کو حاصل تھی۔ بلکہ جائز تنقید کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ

کسی غلط فہمی کی بناء پر بڑے سے بڑے برگزیدہ خلیفہ کو بر سر عام نار وا تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا لیکن ایسے مواقع پر بھی خلفاء اور ان کے مقرر کردہ حکام نے خندہ پیشانی سے تنقید کو سنا، برداشت کیا اور اپنا دفاع کیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر وہ حق جو انسان استعمال کرتے ہیں اس حق کے غلط استعمال کا امکان ہمیشہ رہتا ہے اس لیے کہ انسان خطاء کا پتلا بھی ہے اور بد نیتی سے بھی مبرا نہیں ہے لیکن کسی حق کے غلط استعمال سے اس حق کو ختم کرنے کا جواز فراہم نہیں ہو جاتا اور یہی بات ہمیں سیرت رسول ﷺ میں واضح طور پر ملتی ہے کہ آپ نے جو ریاستی نظام وضع فرمایا اور اس کے ذمہ داروں کو جو تربیت دی اس تربیت کا لازمی حصہ یہ تھا کہ دوسروں کی تنقید سے پہلے خود اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو اپنے ہر قول اور عمل پر نظر ثانی کرتے رہو اور اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے ہمہ وقت مغفرت طلب کرتے رہو اور اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا حتی الامکان مداوا اور تدارک کرتے رہو۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی عظیم الشان تربیت پانے والے نفوس قدسیہ کسی کی تنقید پر کیوں ناگواری ظاہر کرتے بلکہ یہ تو وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے کو قسمیں دے دے کر اپنی غلطیوں کو معلوم کیا کرتے تھے۔ لہذا یہ اسلامی ریاست کا ایک بنیادی اصول ہے جو ہمیں سیرت طیبہ میں بہت واضح طور پر ملتا ہے کہ حکمران کو ہر قسم کی تنقید کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

پانچواں اصول جدید ریاست کا جو آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ میں ہمیں ملتا ہے جو آپ نے پوری قوت سے نافذ فرمایا وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے جملہ وسائل کی ملکیت میں تمام اہل ایمان افراد شریک ہیں۔ جو وسائل بھی ریاست کے پاس جائز طریق سے جمع ہوں ان سے نفع حاصل کرنے میں سب کا حصہ برابر ہونا چاہیئے۔ کسی گروہ کو، علاقہ کو، خاندان یا قبیلہ کو ان وسائل پر ایسا تصرف حاصل نہیں ہونا چاہیئے جس کے نتیجہ میں دوسرے افراد، گروہوں یا علاقوں کے ساتھ کسی طرح کی بے انصافی کی راہ نکل سکے۔ اس کے علاوہ ان وسائل کی تقسیم اور انتظام و انصرام میں مشاورت کا عمل جاری ہونا چاہیئے۔ تمام وسائل سمٹ کر دولت امیر ترین افراد سے نکل کر غریب ترین افراد کے ہاتھوں میں آتی رہے۔ اس اصول کو بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

''تؤخذ من اغنیاء هم وترد الی فقرا ئهم''

کہ زکوۃ وصدقات کا اصول یہ ہے کہ امیر ترین افراد سے لے کر غریب ترین لوگوں کو لوٹائی جاتی رہے ' ظاہر ہے کہ جب طویل عرصہ تک یہ عمل جاری رہے گا تو ایک وقت آئے گا کہ معاشرہ میں معاشی اونچ نیچ اگر بالکلیہ ختم بھی نہ ہو گی تب بھی بہت کم رہ جائے گی۔ اسلامی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ان زریں معاشی تعلیمات پر عمل درآمد کا بعینہ یہی نتیجہ نکلا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جن کا دور خلافت آنحضرتؐ کے وصال سے سو برس کے اندر اندر ہی آگیا تھا' ان کے دور میں چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ مکہ مدینہ 'بصرہ کوفہ اور بغداد کے بازاروں میں لوگ مال زکوۃ سونا چاندی لیے پھرتے تھے کہ یہ زکوۃ کا پیسہ ہے 'کوئی مستحق ہو تو لے لے۔ اسی حال میں شام ہو جاتی اور کوئی مستحق نہ ملتا اور لوگ مایوس لوٹ جاتے بالآخر یہ پیسہ سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا جاتا۔ بلکہ اس سے پہلے اسی طرح کی صورتِ حال عثمان بن عفانؓ کے دورِ خلافت میں بھی آچکی تھی اسی دور حکومت میں یہ واقعہ بھی ہوا کہ خلیفہ نے اپنے گورنر سے اس بات پر باز پرس کی کہ بجائے مقامی ضروریات میں خرچ کرنے کے سرکار دو عالمؐ کے عطا کردہ نظام حکومت کی برکات کا عالم یہ تھا کہ جواب طلبی اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ پیسہ جو کہ عوام کا' رعایا کا' شہریوں کا حق ہے انہی کی فلاح وبہبود پر کیوں نہیں خرچ کیا گیا اور کیوں اس کو مرکزی خزانہ میں جمع کرایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان حکام کو بیت المال کے وسائل کو جس نہج پر استعمال کرنے کی تربیت دی تھی اس کا اندازہ حضرت عمر فاروقؓ کے اس فرمان سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکمران کو بیت المال کا پیسہ اس طرح خرچ کرنا چاہئے جس طرح یتیموں کے مال کو متولی خرچ کرتا ہے۔ وہ پوری امانت ودیانت سے اپنے زیر نگرانی یتامٰی کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اور اس مال میں سے اپنی ضروریات کے لیے صرف بقدر ضرورت خرچ کرنے کا مجاز ہے۔

۶ : اس ریاست کا چھٹا اصول یہ ہے کہ اس کے حکمران وہ لوگ ہوں جو سب سے پہلے خود ان اصول پر عمل کرنے والے ہوں جن کے وہ علم بردار ہیں' اس کے بعد شہریوں سے عمل کا مطالبہ کریں۔ اس مثالی ریاست کے بانی رسول اللہ ﷺ خود ہی اس اصول کا سب سے عظیم چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ آپ اپنے ہر قول عمل 'اٹھنے بیٹھنے 'سونے جاگنے 'کھانے پینے 'جنگ وامن' تجارت وکاروبار' خاندانی زندگی 'انسانی تعلقات' سیاسی طرز عمل' معاشی رویہ 'آداب مجلس'

طریق میزبانی، سفر و حضر، فکر و عمل، الغرض اس زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی عمل میں رہتی دنیا کے لیے ایک بہترین نمونہ تھے۔ پھر حیثیت حکمران آپ کی زندگی میں یہ اصول کیوں کارفرما نہ ہوتا۔ اسی اصول کو آپکے بعد خلفاء راشدینؓ نے پوری طرح اپنے اوپر نافذ کر کے دکھادیا۔ اگر ریاست کے دیگر اہلکاروں سے اور عام شہریوں سے عدل وانصاف، دیانت صداقت، شجاعت، امانت، قربانی، سادگی، انکساری، خلوص وبے لوثی، ہمدردی اور غمگساری کے رویوں کا مطالبہ کیا جائے تو حکمرانوں پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس طرز عمل کا نمونہ بن کر دکھائیں۔ ظاہر ہے کہ زبانی کلامی تبلیغ سے انسانوں کو بہتر رویوں کا خوگر نہیں بنایا جاسکتا۔ کوئی قائد اگر اپنی جماعت کو اعلیٰ مقاصد و بہترین ضوابط کا پابند بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ پہل اپنے آپ سے کرے۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک کا روشن ترین پہلو یہی ہے کہ آپ نے قرآن کی دعوت دینے سے پہلے، اس کی تعلیم کو جاری کرنے سے پہلے اس کے احکام کو نافذ کرنے سے پہلے خود اپنے آپ کو چلتا پھرتا قرآن بن کر دکھایا۔

ان تمام اصول کا تعلق جو اوپر بیان کیے گئے، ان امور سے ہے جو اس دنیا کی فلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی ریاست اس دنیا ہی میں قائم ہوتی ہے اور ہوئی ہے اور آئندہ بھی ہونی ہے لہذا اس کے قیام کا منشا اس دنیا کو بھی سنوارنا ہے اور انسانی زندگی کی ترقی و تہذیب بھی ہے۔ یہاں رہ کر انسانوں کو جو ضروریات پیش آتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ ان اصول کی پابندی سے خوبی ہو جاتا ہے جو اوپر بیان کیے گئے اور تاریخ گواہ ہے کہ ماضی میں جب بھی مسلمان حکمران ان اصول پر کاربند ہوئے۔ اس کے نتائج انسانی زندگی میں ہمیشہ خوشگوار تبدیلیوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

البتہ دوسرا اہم تر شعبہ اسلامی ریاست کا وہ ہے جس کا تعلق عقائد اور اخلاقیات سے ہے۔ جس طرح ایک فرد کی زندگی کی کچھ مادی ضروریات ہیں، جبلی تقاضے ہیں، جن کی تحصیل بہر حال وہ کرتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر اس کے اخلاقی شعور کے کچھ مطالبات ہیں اس کے قلب کے روحانی مقاصد ہیں اور ان کی تکمیل کے بغیر اس کی انسانیت ناقص اور نامکمل رہتی ہے، اس طرح اسلامی ریاست کا ایک ارضی پہلو ہے۔ اس ارضی پہلو کو درست رکھنے کے رہنما اصول

اوپر بیان کر دیئے گئے جو کہ ہمیں سیرت طیبہ میں ملتے ہیں۔ اس ارضی پہلو کے ساتھ بلکہ اس سے بڑھ کر اسلامی ریاست کا ایک سماوی پہلو ہے۔ یہی سماوی پہلو اس کی اصل شناخت اور حیثیت کو متعین اور ممتاز بناتا ہے۔ اس سماوی پہلو سے مراد اسلامی ریاست کا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ بعینہ وہی ہے جو اس ریاست کی ابتدائی اکائی یعنی مرد مومن کا عقیدہ ہے یعنی : لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس عقیدہ کو اختیار کرنے کے بعد جس طرح افراد کی زندگیوں کا رخ اور مطمح نظر یکسر بدل جاتا ہے اسی طرح ان افراد پر مشتمل معاشرہ اور اس معاشرہ کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ریاست کا رخ اور نصب العین باقی تمام معاشروں' تہذیبوں اور ریاستوں سے الگ اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

ریاست کی نظریاتی ' یا روحانی شناخت کے بے شمار اخلاقی تقاضے ہیں۔ ریاست ان تقاضوں کی تکمیل کو ہر حال میں فوقیت دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی قائم فرمودہ مثالی ریاست نے جنگ و امن' غربت و تونگری' خوف اور خوشحالی' خوشی غمی ہر صورت حال میں ان اعلیٰ اخلاقی اقدار اور ارفع روحانی اصول کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان پر ہمیشہ کاربند رہنے کو ترجیح دی' چاہے اس کے نتیجہ میں ریاست کے مادی و دنیوی مفادات کا جتنا بھی نقصان اٹھانا پڑے۔ عین جنگی لام بندی کے موقع پر' غزوہ احد میں جب کہ مسلمانوں کو اپنے سے کئی گنا زیادہ بڑے اور طاقتور دشمن کا سامنا تھا' رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک صحابی حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنے اسلحہ سمیت اپنی خدمات آپ کو پیش کر دیں مگر ساتھ ہی یہ بتایا کہ وہ کفار مکہ کے نرغہ سے نکل کر آئے ہیں وہ دشمن کی قید میں تھے اور آنحضرتؐ کی جانب سے غزوہ کی تیاری کا سن کر بے قرار ہوئے اور کسی بہانہ سے دشمنوں سے وقتی رہائی حاصل کی اور مسلمانوں کے لشکر سے آملے۔ آپ ﷺ نے ان صحابی کو واپس جانے کا مشورہ دیا اور یہ فرمایا کہ ہمارے لیے اس حال میں بھی عہد کی پاس داری ایک جنگجو تربیت یافتہ مجاہد کے حصول سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ محض سینکڑوں ہزاروں مثالوں میں سے ایک مثال ہے اس بات کی کہ اسلامی ریاست کے اخلاقی اصول اٹل اور ناقابل مفاہمت ہوتے ہیں۔ یہی اس ریاست کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے۔ اس روحانی اور اخلاقی شناخت کی حفاظت کے لیے ریاست ہمہ وقت اقدامات اور کوششوں میں مصروف رہتی ہے اور مسلسل افراد کو' خاندانوں کو' قیادتوں کو' مہارتوں کو ایک بامقصد نظام تعلیم و تربیت کے ذریعہ

تیار کرتی رہتی ہے تاکہ وہ اپنی اپنی جگہ پر' ہر ہر سطح پر اس روحانی اور اخلاقی شناخت کی حفاظت اور ان اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی سربلندی کے لیے کام کرتے رہیں۔ جو کہ اس ریاست کی اصل حیثیت کو متعین کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے اس پہلو کے جسے ہم نے سماوی پہلو کا نام دیا' بے شمار تقاضے ہیں اور زندگی کے ہر قدم پر یہ تقاضے ریاست اور اس کے کارکنوں کو درپیش رہتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو بڑی جامعیت سے اس آیت قرآنی میں سمو دیا گیا ہے :

''الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ وآتوُا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ولله عاقبة الامور''
(الحج :۴۱)

''کہ اگر ہم ان لوگوں کو زمین میں تمکنت عطا کرتے ہیں تو یہ نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں' اچھائی کا حکم دیتے ہیں' اور برائی سے روکتے ہیں اور اللہ ہی کی جانب معاملات کے بالآخر نتائج راجع ہوتے ہیں''

نماز قائم کرنے کے عنوان کے تحت تمام دینی وروحانی اعمال واہداف آجاتے ہیں' زکوۃ دینے کے عنوان میں تمام فلاحی امور آجاتے ہیں' امر بالمعروف کی ذمہ داری میں تعلیم و تربیت اور تزکیہ کا سارا نظام شامل ہے اور نہی عن المنکر کے عمل میں وہ تمام اقدامات اور پالیسیاں شامل ہیں جو ہر قسم کی برائیوں کو روکنے کے لیے اختیار کی جائیں' چاہے ان کا تعلق داخلی جرائم سے ہو یا بین الاقوامی سطح پر باطل نظریات اور فاسد رویوں کو روکنے سے۔

اور اس آیت کے آخر میں یہ بات بھی بڑی اہم بیان کی گئی ہے کہ آخری نتائج اللہ ہی کی طرف پلٹتے ہیں' ہمیں سب کو اسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے' ہمارے تمام اعمال بھی افعال بھی اقوال بھی آخر کار اس احکم الحاکمین کے دربار میں پیش ہونے والے ہیں اور وہی ہر نظریہ اور عمل کی آخری قیمت لگائے گا اور ہر ایک فرد کا حساب چکائے گا۔ :

اللہ تعالیٰ ہمیں اسوہ رسول اکرم ﷺ کو صحیح معنی میں سمجھنے اور اس کے تقاضوں پر خلوص نیت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!۔